فروری
۱۹۶۲ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے۔
سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ)

ماہنامہ — لاہور

میثاق

جلد ۱۰	شعبان المعظم ۱۳۸۴ھ	شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

۱	اداریہ	تذکرہ و تبصرہ ـــــ ـــــ	امین احسن اصلاحی	۲
۲	تدبرِ قرآن	تفسیر سورۂ بقرہ ـــــ ـــــ	امین احسن اصلاحی	۱۰
۳	مقالات	احادیث کی جمع و تدوین ـــــ ـــــ	مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی	۳۰
۴	بحث و نظر	خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب ـــــ ـــــ	امین احسن اصلاحی	۳۷

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ:-

منیجر ماہنامہ میثاق ○ رحمان پورہ، اچھرہ، لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کے لئے ترسیلِ زر کا پتہ:-

منیجر دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح

سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی

اپنی زندگی کے آخری لمحات مبارک میں یہ نصیحت فرمائی ہے کہ اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ کی طرف سے ہے۔ اس وجہ سے کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اس ذمہ داری میں کوئی خلل پیدا کرے، نیز مسلمانوں کو یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر اقلیتوں کے ساتھ انہوں نے کوئی بدعہدی اور زیادتی کی تو قیامت کے دن خدا کی عدالت میں خود محمد رسول اللہ صلعم ان اقلیتوں کے وکیل ہوں گے۔ اسلام کی ان تعلیمات کا اور تاریخ کی روشن روایات کا یہ اثر ہے کہ پاکستان کی مذہبی جماعتوں میں سے بھی کوئی جماعت غیر مسلموں کے خلاف کوئی تعصب نہیں رکھتی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کا وہ کون سا عمل ہے جس کا ردعمل بھارت میں آئے دن مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی عزت و آبرو کی بربادی کی شکل میں ہو رہا ہے۔

ہم یہ بات بھی پورے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ پاکستان کے اندر شاید ایک مسلمان بھی ایسا نہ ملے جو عمل اور ردعمل کے اس شیطانی فلسفہ پر اعتقاد رکھتا ہو جس پر بھارت کے لیڈروں کا ایمان ہے۔ یہ فلسفہ اسلامی شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ ہمارے ملک میں جو غیر مسلم اقلیتیں ہیں وہ صرف اپنے قول و فعل کی ذمہ دار ہیں، دوسروں کے قول و فعل کی کوئی ذمہ داری ہم ان پر نہیں ڈالتے۔ وہ اگر ملک کے قانون کی پابند اور ریاست کی وفادار رہیں تو حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کے جان و مال اور ان کے شہری حقوق کی ہر قیمت پر حفاظت کرے، اس بات سے ان کی عرفی حیثیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہو سکتا کہ کلکتہ میں ان کے ہم مذہبوں نے ہمارے اسلامی بھائیوں کا قتل عام کیا۔

اگرچہ ہم یہ توقع نہیں رکھتے کہ بھارت کے لیڈروں کی سمجھ میں ہماری کوئی بات آسکے گی تاہم حقیقت کا اظہار ایک فرض انسانی ہے اس وجہ سے ہم عرض کرتے ہیں کہ قومی جرائم پر "ردعمل" کا پردہ ڈال کر ان کو ہلکا دکھانا اپنے ضمیر کو موت کی نیند سلانا اور اپنی قوم کو ایسا زہر پلانا ہے جس سے پوری قوم پاگل ہو جائے۔ حکمرانی ایک عظیم ذمہ داری ہے جس کی بنیاد عدل پر ہے۔ ہر حکومت کا یہ ابتدائی فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کے ہر طبقہ کے لئے امن، عدل اور قانونی انصاف کی ضمانت فراہم کرے۔ اسی سے حکومت کے قیام کے لئے جواز پیدا ہوا ہے اور اسی کو فراہم کرنے کی خاطر خدا نے، جو آسمان و زمین کا حقیقی حکمران ہے، اپنے نظام میں حکومت کے لئے ایک مقام تسلیم کیا ہے۔ اگر کوئی حکومت اپنی رعایا کے لئے امن و عدل فراہم نہیں کرتی تو وہ اپنے وجود کی ضرورت کی خود نفی کر دیتی ہے اور اس کے بعد قدرت اس حکومت کے وجود سے اپنی زمین کو پاک کر دیتی

ہے۔ اس معاملے میں قدرت بالکل بے لاگ واقع ہوئی ہے۔ اس کی میزان نے اپنے فیصلہ میں کبھی امتیاز نہیں برتا ہے اور آئندہ بھی وہ کبھی امتیاز نہیں برتے گی، خواہ معاملہ بھارت کا ہو یا پاکستان کا۔

عدل کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ کوئی اضافی صفت نہیں ہے کہ ہندو کے لئے آپ عادل ہوں اور مسلمانوں کے لئے غیر عادل۔ جو شخص ایک کے لئے غیر عادل اور ظالم ہے وہ سب کے لئے غیر عادل اور ظالم ہے۔ میں بحیثیت مسلمان کے یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اگر میں ایک غیر مسلم کے ساتھ انصاف نہیں کرتا تو اپنے باپ بھائی کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت جس طرح انفرادی دائرے میں حقیقت ہے اسی طرح اجتماعی دائرے میں بھی حقیقت ہے۔ جو قوم مسلمانوں کے ساتھ عدل نہیں کر سکتی اس کے افراد خود اپنے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکیں گے اور جس طرح مسلمانوں کے لئے آپ کے پاس ردعمل کا عذر ہے اسی طرح ان میں سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی عذر ہاتھ آجائے گا جس کے پردے میں وہ اپنے ہر ظلم کو ثواب بنا لے گا۔ اس وجہ سے ہم بھارت کے لیڈروں سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کے لئے بدآموزی کی یہ راہ نہ کھولیں۔ اس کا ہمیں تو جو نقصان پہنچیگا وہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ خدانخواستہ بھارت میں مسلمان ختم ہو جائینگے لیکن اس کا دوسرا پہلو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ قدرت کے قانون کی رُو سے بھارت کی حکومت اپنے مقصد وجود کی نفی کر دے گی۔ ہم یقین رکھتے ہیں اور اس یقین کے لئے ہمارے پاس نہایت مضبوط دلائل ہیں کہ اگر گاندھی جی اس دنیا میں پھر آجائیں تو وہ اپنی قوم کو اس راستہ پر ہرگز جانے کی اجازت نہ دیں گے اگرچہ انہیں اس کی سزا میں کسی اور گوڈسے کے پستول سے دوبارہ مرنا ہی کیوں نہ پڑے۔ ہم از راہ محبت انسانی یہ آرزو رکھتے ہیں کہ کاش گاندھی جی کے نام لیواؤں میں کوئی شخص ایسا اُٹھتا جو مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ خود اپنی قوم کو اس زہر ہلاہل سے بچانے کی خاطر جان کی بازی کھیل سکتا!!

ہم اس امر واقعی کا اظہار و اعلان بھی برملا کرتے ہیں کہ پاکستان کے مسلمان بھارت کے مسلمانوں کے معاملات سے کبھی اپنے آپ کو بے تعلق نہیں کر سکتے۔ ان کے ساتھ ہمارا ایمانی رشتہ بھی ہے اور خونی رشتہ بھی۔ ان دو دو مضبوط رشتوں کی موجودگی میں یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان سے اور ان کے حالات و مسائل سے بالکل بیگانہ بنا لیں۔ اسی طرح ہم یہ توقع بھی نہیں رکھتے کہ بھارت کے ہندو پاکستان کے ہندوؤں کے معاملات و مسائل سے بالکل بے تعلق ہو جائیں گے اس لئے کہ

ہماری ہی طرح وہ بھی اپنے بھائیوں سے دو دو ہند حصوں میں بندھے بڑے ہیں لیکن اس امر واقعی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک امر واقعی ہے کہ بھارت کے مسلمان اور پاکستان کے ہندو اپنی اپنی حکومتوں کی رعایا ہیں۔ ان گوناگوں تعلقات اور ذمہ داریوں کو حسن وخوبی اور کامیابی کے ساتھ نباہنے کی بھارت اور پاکستان دونوں کے لئے ایک اور صرف ایک ہی راہ ہے۔ وہ یہ کہ دونوں حکومتیں اپنی اپنی اقلیتوں کو امن، عزت اور عدل کی زندگی فراہم کریں۔ یہ نہایت واضح حقیقت ہے جس کے سمجھنے کے لئے معمولی عقل بھی کافی ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ پاکستان نے اس حقیقت کو سمجھنے میں ایک دن کی دیر بھی نہیں لگائی۔ ہمیں یاد ہے کہ قائدِ اعظم نے قیام پاکستان کے بعد اپنی [illegible] میں نہایت واضح الفاظ میں اس کا اعلان کر دیا تھا۔ اور یہاں کے مسلمانوں نے صدق دل سے ان کے اس اعلان کو قبول کر لیا۔ گاندھی جی بھی اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے اور انہوں نے بھی اس کے اظہار و اعلان میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن افسوس ہے کہ ہندو قوم نے من حیث القوم اب تک اس حقیقت کو قبول نہیں کیا۔ پاکستان کے قیام سے اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف ایک ایسی گرہ پڑگئی ہے جو کسی طرح کھلتی ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ پاکستان کو تسلیم کرنے پر اپنے دل کو راضی کر سکی نہ مسلمانوں کو اپنے اندر گوارا کرنے کے لئے۔ اسی بات کا یہ نتیجہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا موسم ہمیشہ گرم رہتا ہے اور یہ بات شاید اب تک وہاں بڑے بڑوں کی سمجھ میں بھی نہیں آئی کہ غصہ اور انتقام کے جذبات وقتی طور پر تو اپنے اندر کچھ جواز کے پہلو ممکن ہے رکھتے ہوں لیکن اگر کوئی قوم انہی جذبات کو اپنا کیش ومشرب بنالے تو عالم انسانی کی پوری تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ایسی قوم دوسروں کو بہانے کے بجائے خود ان جذبات کے سیلاب میں بہ گئی ہے۔

اب ہمارے بھارت کے ہندو بھائیوں کو یہ بات مان لینی چاہیئے کہ پاکستان ایک حقیقت ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی مان لینی چاہیئے کہ ۵ کروڑ مسلمان جو بھارت میں موجود ہیں وہ بھارت کے شہری ہیں اور اکثریت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے حقوق تسلیم کرے اور ان کی حفاظت کرے۔ حقایق اور ذمہ داریوں کو تسلیم کرنے ہی سے قومیں سرخرو ہوتی اور عزت پاتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی قوم حقایق کو جھٹلائے اور ذمہ داریوں کو پامال کرے تو اس سے وہ دوسروں کی راہ میں جتنی مشکلیں پیدا کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ خود اپنی راہ کانٹوں سے بھر دیتی ہے۔ اب پاکستان کی مخالفت کا وقت

گزر گیا اب پاکستان اور بھارت دونوں واقعات کی شکل میں موجود ہیں اور دونوں کی بہبود کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دوست اور خیر خواہ بنیں اور ان باتوں سے بچیں جو باہمی تعلقات کو خراب کرنے والی ہیں۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ بھارت کے مسلمانوں کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن سے بے تعلق رہنا پاکستان کے مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں ہے اس وجہ سے اگر بھارت میں مسلمان اسی طرح پامال ہوتے رہے جس طرح آج پامال ہو رہے ہیں تو اس کا یہ ردعمل تو انشاءاللہ ہرگز نہیں ہوگا کہ یہاں کی ہندو اقلیت کو کوئی ضرر پہنچے لیکن یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے کبھی دوست نہ ہو سکیں گے۔ اب یہ بھارت کے لیڈروں کا کام ہے کہ وہ ذہنی توازن کے ساتھ سوچیں کہ یہ عمل اور ردعمل کا خونیں ڈراما ان کے لئے اور ہمارے لئے مفید ہے یا دوستی اور اعتماد کی وہ فضا جس میں دونوں ملک اپنی تعمیری سرگرمیوں میں مصروف ہو سکیں۔

آخر میں ہم بھارت کے مظلوم مسلمانوں سے بھی ایک بات کہنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ ان کی زندگی اور عزت دونوں کی ضمانت ایمان میں مضمر ہے۔ ایمان کے ساتھ زندگی بھی زندگی ہے اور موت بھی زندگی ہے۔ ایمان پر جمے رہنے کی صورت میں مومن مرتا نہیں ہے بلکہ اپنی موت سے ہزاروں لاکھوں زندگیاں پیدا کرتا ہے۔ اصلی طاقت انسانوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا ہاتھ غیر مرئی ہے لیکن ہے بڑا طاقتور وہ دیر میں نمودار ہوتا ہے لیکن مظلوموں کے لئے نمودار ضرور ہوتا ہے اور جب نمودار ہوتا ہے تو کوئی اس کو روک یا پکڑ نہیں سکتا۔ اس کے نمودار ہونے کا وقت وہ ہوتا ہے جب مومن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا ہے لیکن وہ بے صبر یا مایوس نہیں ہوتا بلکہ اپنے رب اور صرف اپنے رب ہی سے آس لگائے، اُمید کا دیا جلائے، ناصر غیب سے لو لگائے ایمان پر جما رہتا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اگر بھارت کے مسلمانوں نے ایمان کی حبل اللہ مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھی تو وہ کتنے ہی بے سہارا اور ناتواں کیوں نہ ہوں لیکن یہ رسی بڑی مضبوط ہے، انہیں کوئی طاقت بھی ہلا نہ سکے گی۔ کیا عجب کہ خدا نے تمام جھوٹے سہاروں سے اسی لئے ان کو الگ کیا ہو کہ ان کے لئے تنہا اپنے سہارے کی شانیں دکھائے۔ ہم یہ دُعا کرتے ہیں کہ خدا ہر آزمائش میں ان کا یار و ناصر ہو۔

سب سے آخر میں ہم پاکستان کے مسلمانوں کو وہ بات پھر یاد دلانی چاہتے ہیں جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ انفرادی، اجتماعی اور سیاسی زندگی کے کسی گوشے میں بھی "ردعمل" کا فلسفہ

ہمارے لئے رہنما نہیں بن سکتا جو زید کے جرم کا انتقام بکر سے لینے کو جائز ٹھہراتا ہو۔ اس ملک کی اقلیتوں کے ساتھ ہمارا معاملہ اسلام کے اسی اصول پر مبنی ہوگا جس کا حوالہ ہم نے اُوپر دیا ہے کہ جب تک وہ ملک کی وفادار رہیں ہم ان کے جان، مال، عزت، مذہب اور حقوق کے محافظ ہیں اور ہماری حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان کی ان ساری چیزوں کی حفاظت کرے اور ملک کی سیاسی زندگی میں ان کو تمام آئینی راستوں سے فائدے اُٹھانے کے مواقع بہم پہنچائے۔ یہ صرف سیاست اور جہاں بانی ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ ہر مسلمان اور ہر اسلامی حکومت پر خدا اور رسول کا مقرر کیا ہُوا فریضہ ہے اور جو مسلمان بھی اس کی خلاف ورزی کریگا وہ اسلامی شریعت کی مخالفت کرے گا اور قیامت کے دن خدا کی عدالت میں اس کے خلاف خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استغاثہ دائر فرمائیں گے۔ اس اصول کے احترام میں اس بات سے کوئی فرق واقع نہیں ہو سکتا کہ بھارت میں مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ بھارت کے ہندوؤں کے کسی فعل کی ذمہ داری بھی ہماری اقلیتوں پر نہیں ہے۔ پاکستان کی حکومت کو اگر بھارت کے مسلمانوں کا درد ہے (اور یہ درد اسلامی رشتے کی بنا پر لازماً ہونا چاہیے) تو وہ حکومتی سطح پر اس سلسلے میں جو قدم مناسب خیال کرے اُٹھائے (اور اس پر یہ حق ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے وہ قدم اُٹھائے) لیکن یہ بات ہم صاف کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے مذہب کا مطالبہ ہم سے یہی ہے کہ ہمارے ملک کی اقلیتیں جب تک اپنے عہد کی وفادار رہیں ہم پر فرض ہے کہ ان سے کئے ہوئے عہد اور ان کو دی ہوئی ضمانات کے ہم وفادار رہیں۔

اس معاملے کا ایک نازک پہلو بھی ہے جس کو خاص طور پر ہر پاکستانی کو ملحوظ رکھنا چاہیے وہ یہ کہ بھارت نے چونکہ مسلمانوں پر مظالم ڈھانے کے لئے ردعمل کا بہانہ اختیار کیا ہے اس وجہ سے اس کا طریقہ یہ ہے کہ پاکستان میں اگر رائی کے برابر بھی کوئی زیادتی کی بات ہو تو وہ اس کو پربت بناتا ہے تاکہ مسلمانوں پر پہاڑ گرانے کے یہ رائی اُوٹ کا کام دے سکے۔ اس پہلو سے بھی ہمارے لئے صحیح روش یہی ہے کہ ہم کوئی چھوٹا سے چھوٹا بہانہ بھی ایسا نہ پیدا ہونے دیں جو اسلام کی بدنامی اور ہمارے دینی بھائیوں کی بربادی کے لئے پردے کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

تدبرِ قرآن

امین احسن اصلاحی

۳۷

تفسیر سورۃ البقرۃ

۷۲۔ آگے کا سلسلۂ کلام (آیات ۲۱۵-۲۲۱)

اُوپر کا مضمون واضح ہو چکا ہے، کہ حج کے مضمون سے بطور ایک التفات کے پیدا ہو گیا تھا جس سے اہل نفاق کو ایک مناسب موقع تنبیہہ ہو گئی اور اہل ایمان کو ایک برمحل تذکیر۔ اصل سلسلہ بیان حج اور جہاد و انفاق سے متعلق تھا چنانچہ اس ضمنی مضمون کے ختم ہونے کے بعد وہ سلسلہ کلام پھر لوٹ آیا اور مذکورہ چیزوں سے متعلق اس دوران میں لوگوں کے اندر جو سوالات پیدا ہوئے ان کے جوابات دیئے گئے۔

یہ سوالات، جیسا کہ آگے کی تفصیلات سے واضح ہوگا انہی مسائل سے متعلق ہیں جو اُوپر زیر بحث آئے ہیں۔ البتہ شراب اور جوئے سے متعلق جو سوال ہے وہ اس موقع پر ان لوگوں کو شاید بے جوڑ معلوم ہو جو عرب کے اس زمانے کے تمدنی و معاشرتی حالات سے واقف نہیں ہیں جس زمانے میں یہ آیتیں اُتری ہیں یہ سوال در حقیقت اس انفاق کے تعلق سے یہاں پیدا ہوا ہے جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔ ہم آیات کی وضاحت کرتے ہوئے بتائیں گے کہ عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کے جہاں بہت سے مضر پہلو تھے وہاں ان کے بعض مفید پہلو بھی تھے۔ عرب کے سخی اور حوصلہ مند لوگوں میں یہ روایت تھی کہ قحط خاص طور پر سردیوں کے زمانے میں، وہ جگہ جگہ اکٹھے ہوتے، خوب شراب پیتے پھر شراب کی مستی میں جس کسی کے اُونٹ یا اُونٹنی کو چاہتے ذبح کر دیتے، اس کے مالک کو منہ مانگے دام دے دیتے اور پھر اس کے گوشت پر جوا کھیلتے اور ہر شخص جتنا گوشت جیتتا جاتا وہ ان غریبوں اور فقیروں میں لٹاتا جاتا جو اس طرح کی کسی تقریب کی خبر سن کر موقع پر

پیسے جمع ہو جاتے۔ یہ روایت عرب میں بڑی محبوب روایت تھی۔ جب شمال کی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں اور ملک میں قحط کی سی حالت پیدا ہو جاتی تو جو لوگ اس قسم کی تقریبیں منعقد کرتے یا ان میں شریک ہوتے ان کو بڑا سخی داتا سمجھا جاتا اور سوسائٹی میں ان کی بڑی عزت ہوتی۔ اس کے برعکس جو لوگ اس چیز سے الگ الگ رہتے ان کے لئے ایک خاص لفظ "برم" کا استعمال ہوتا جس کے معنی بخیل کے ہیں۔

عرب شعراء اس جوئے اور شراب کا ذکر اپنے قصائد میں بڑی دھوم دھام سے کرتے ہیں۔ میں یہاں بعض مشہور شعراء کے کلام کے حوالے نقل کرنا چاہتا ہوں لیکن اس قسم کی خالص علمی چیزوں سے عام قارئین کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھاتے اس وجہ سے مناسب معلوم ہوا کہ یہ اشعار یہاں نقل کرنے کے بجائے اصل کتاب میں... (جب اس کے کتابی صورت میں چھپنے کی نوبت آئے) حاشیہ پر نقل کر دیئے جائیں۔

غرض جوئے اور شراب کا یہ پہلو تھا جس کی وجہ سے عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں ان کا شمار فیاضی اور سخاوت کے خصائل اور خدمتِ خلق اور ہمدردی غربا کے محرکات میں سے ہوتا تھا۔ چنانچہ جب قرآن نے انفاق اور ہمدردی غربا پر بہت زور دیا تو بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جب اسلام غریبوں اور یتیموں کی ہمدردی اور ان کی امداد کے لئے مال خرچ کرنے پر اتنا زور دیتا ہے تو آخر اس جوئے اور شراب میں کیا خرابی ہے جو قحط کے زمانے میں غربا کی امداد کا ذریعہ بنتے ہیں۔ قرآن نے یہاں اسی سوال کو نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے کہ اس میں شبہ نہیں کہ ان چیزوں سے سوسائٹی کو بعض اعتبارات سے کچھ فائدے تو ضرور پہنچ جاتے ہیں لیکن ان سے فرد اور سماج دونوں کو جو مادی و اخلاقی نقصانات پہنچتے ہیں وہ ان کے فوائد کی نسبت سے بہت زیادہ ہیں اس وجہ سے اسلام نے ان کو حرام قرار دیا۔

یہ سوال بالکل اسی طرح کا سوال ہے جس طرح کا سوال وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو آج قحط، زلزلہ اور سیلاب وغیرہ کے مصیبت زدوں کی امداد کے لئے فنڈ جمع کرنے کی خاطر رقص و سرود کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں یا سینما کے شو دکھاتے ہیں یا فلم اسٹاروں کے مظاہرے اور ان کے میچ کراتے ہیں۔ ان لوگوں کو بھی اگر ان بُرے راستوں کے اختیار کرنے پر (اگرچہ وہ کسی اچھے ہی مقصد سے اختیار کئے گئے ہوں) ملامت کی جاتے تو وہ کہتے ہیں کہ جب ہم یہ کام انسانیت کی خدمت کے لئے کر رہے ہیں تو آخر اس میں کیا خرابی ہے؟ درحقیقت یہ لوگ بھی عرب جاہلیت کی طرح اپنی ان حماقتوں کے صرف انہی پہلوؤں کو دیکھتے ہیں جو ان کی نگاہوں میں بظاہر نفع عوام کے ہیں ان کی نظر ان ہولناک نقصانات کی طرف نہیں جاتی جو ان سے پورے معاشرے کو پہنچتے ہیں۔

یہاں ہم صرف اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔ آگے آیات کی تفسیر کے تحت اس کی ضروری تفصیل آئے گی۔

اسی طرح اس ضمن میں یتامیٰ سے متعلق بھی ایک سوال پیدا ہوا۔ اوپر انفاق کے سلسلہ میں والدین اور اقرباء کے ساتھ یتیموں کا بھی حوالہ دیا گیا تھا کہ اس انفاق کے مستحق وہ بھی ہیں۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے خاندان کے کسی یتیم کے معاملات کو جس کی اس کے سر ذمہ داری ہے اپنے ساتھ شامل کر لے اور اس کی ماں کے ساتھ نکاح کر لے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔ یہاں قرآن نے اس سوال کے بھی بعض پہلوؤں کو واضح فرمایا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت کیجئے تو وہ بالکل مربوط کڑیوں کی شکل میں نظر آئیں گی۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ

ع لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ ۲۲۱

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا کچھ خرچ کریں؟ کہہ دو جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو تو وہ والدین، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہو اور جو نیکی بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۲۱۵

تم پر کفار سے جنگ فرض کی گئی اور وہ تمہارے لئے ایک ناگوار شے ہے۔ ممکن ہے تم ایک شے کو ناگوار خیال کرو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک شے کو پسندیدہ سمجھو اور وہ تمہارے لئے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ۲۱۶

وہ تم سے شہر حرام میں جنگ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اس میں جنگ بڑی سنگین بات ہے۔ لیکن اللہ کے راستہ سے روکنا، اس کا کفر کرنا، مسجد حرام سے روکنا اور اس کے لوگوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس جنگ سے بھی زیادہ سنگین ہے اور جبر و ظلم کے ذریعہ سے لوگوں کو دین سے پھیرنا قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور یہ لوگ تم سے برابر جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اگر وہ پھیر سکیں اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا اور حالت کفر میں مرے گا تو یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے۔ اور یہی لوگ دوزخ میں پڑنے والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ البتہ جو لوگ ایمان پر جمے رہیں گے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ اللہ کی رحمت کے متوقع ہیں۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۲۱۷-۲۱۸

وہ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو ان دونوں چیزوں کے اندر بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے۔

اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضروریات سے بچ رہے۔ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم غور کرو، دنیا اور آخرت دونوں کے معاملات میں۔ ۲۱۹

اور وہ تم سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو جس میں ان کی بہبود ہو وہی بہتر ہے اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ شامل کر لو تو وہ تمہارے بھائی ہی ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ کون بگاڑ چاہنے والا ہے اور کون بہبود، اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا۔ بے شک اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۲۲۰

اور مشرکہ عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرو۔ ایک مومنہ لونڈی ایک آزاد مشرکہ سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بھلی لگے۔ اور مشرکوں کو جب تک وہ ایمان نہ لائیں اپنی عورتیں نکاح میں

نہ دو، ایک مومن غلام ایک آزاد مشرک سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بھلا لگے۔ یہ لوگ دوزخ کی طرف بلانے والے ہیں اور اللہ اپنی توفیق بخشی سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنی آیتیں لوگوں کے لئے واضح کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ ۲۲۱

۷۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۥ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۥ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝

اس سورہ میں شروع ہی سے انفاق اور زکوٰۃ کا حکم بار بار آ رہا ہے۔ خاص طور پر آیت ۱۹۵ میں بیت اللہ کی آزادی کے جہاد کے سلسلے میں بڑی تاکید سے انفاق پر ابھارا ہے۔ وہاں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے تو خطاب عام ہے لیکن روئے سخن درحقیقت ان مسلمانوں کی طرف ہے جو جان و مال کی قربانی میں کمزور تھے۔ قاعدہ ہے کہ آدمی کے دل میں اگر کسی چیز سے متعلق کمزوری ہو اور وہ اس کے کرنے کی ہمت نہ کر رہا ہو تو وہ اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے بار بار سوال کرتا ہے اور اس طرح گویا وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ جہاں تک اصل کام کا تعلق ہے اس کو کرنے کے لئے تو وہ جی جان سے حاضر ہے لیکن کرے کیا کہ ابھی تو اصل بات ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ یہی بھید ہے کہ سوالات سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے بہت کم کئے گئے، زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے کیے گئے جو کم ہمت اور بخیل تھے اور اپنی اس کمزوری کو سوالات کے پردے میں چھپانا چاہتے تھے۔ اسی طرح کے لوگ تھے جنہوں نے انفاق کے حکم کے جواب میں یہ سوال اٹھایا جس کا آیت زیر بحث میں حوالہ دے کر جواب دیا گیا ہے۔ اس سوال سے خود اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ گویا وہ انفاق کے مطالبوں سے دبے جا رہے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ مطالبے کس حد پر جا کر رکیں گے۔ چنانچہ قرآن نے سوال کرنے والوں کی اس ذہنیت کو سامنے رکھ کر جواب دیا ہے اور اس جواب کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ تو یہ ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ وہ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں اس کا کوئی حصہ بھی خدا کے جیب میں نہیں جاتا، وہ کسی کے مال و اسباب کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ ایک ہاتھ سے جو کچھ لیتا ہے دوسرے ہاتھ سے ہماری ہی طرف لوٹا دیتا ہے، ہمارے ہی ماں باپ، ہمارے ہی

خویش واقارب، ہمارے ہی یتیم، ہمارے ہی مسکین اور ہمارے ہی مسافر ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ گویا خدا کی راہ میں ہم جو کچھ خرچ کرتے ہیں، کسی دوسرے کی خدمت پر نہیں بلکہ اپنی ہی خدمت پر خرچ کرتے ہیں بس فرق ہے تو یہ ہے کہ اس خرچ کی نوعیت ایک اجتماعی نظم کی ہے جس کا فائدہ سب کو بحیثیت مجموعی پہنچتا ہے۔ یہی حقیقت تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ (ان کے مالداروں سے لے کر ان کو غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے) کے الفاظ سے واضح فرمائی اور اسی بات کی طرف سورۂ سبا کی آیت قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۴۷ (کہہ دو میں نے جو تم سے اجر مانگا ہے وہ تمہارے ہی لئے ہے) بھی اشارہ کر رہی ہے۔

اس جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان جو نیکی بھی کرتا ہے اسے اطمینان رکھنا چاہیئے کہ اس کا ایک ایک ذرہ سب خدا کے علم میں ہے، کوئی چیز نہ تو اس کے علم سے باہر ہے اور نہ کسی چیز کو وہ فراموش کرنے والا ہے، پھر جب وہ سب کچھ جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس کا بھرپور صلہ بھی دے گا پھر جب ہر چیز کا صلہ ملنے والا ہے اور وہ بھی دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک تو ایسے نفع بخش کاروبار میں سرمایہ لگانے سے انسان کیوں گھبرائے؟ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۱۲۱ - توبہ (اور وہ خدا کی راہ میں جو چھوٹا یا بڑا انفاق کرتے ہیں یا کوئی وادی قطع کرتے ہیں تو یہ ان کے لئے لکھ لیا جاتا ہے تاکہ اللہ ان کو اس سے بہتر بدلہ دے)

یہ جواب اگرچہ نہایت واضح اور جامع تھا لیکن اس کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ غالباً اسی کمزوری کے سبب سے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، سوال کرتے ہی رہے چنانچہ آگے آ رہا ہے وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ۲۱۹ (اور وہ تم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہ دو جو ضروریات سے فاضل بچ رہے)

اس جواب نے انفاق کی آخری حد معین کر دی کہ یہ انفاق چونکہ اُمت کے تحفظ و بقا کے جہاد کے سلسلہ کا انفاق ہے اس وجہ سے اس میں دین کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اپنی ناگزیر ضروریات سے جو کچھ بچا سکے وہ سب خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے تیار رہے۔

مولانا فراہیؒ اس آیت کو ذرا اس سے مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی تاویل یہ ہے کہ چونکہ یہ انفاق اس جہاد کے لئے تھا جس کا حکم خانہ کعبہ کو مشرکین کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لئے ہوا تھا اس وجہ سے اس نے مسلمانوں کی ساری توجہ اپنی طرف جذب کر لی اور اس جہاد کی تیاریوں میں وہ اس قدر منہمک ہو گئے کہ انفاق

کے دوسرے مصارف — والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین وغیرہ — کی طرف ان کو وہ توجہ نہیں رہی جو ہونی چاہیئے تھی اس وجہ سے لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ انفاق کی مقدار کیا ہو۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا جائے اس کے اول حقدار وہ مستحقین ہیں جن کا ذکر ہوا پھر مزید جو کچھ خرچ کیا جائے تو وہ سب اللہ کے علم میں رہے گا اور وہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ یہاں مقدار کی تشریح نہیں فرمائی کہ لوگ خود اپنی عقل سے کام لیں اور مختلف دینی ضروریات میں توازن قائم کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی بعض لوگوں کے ذہن میں مقدار سے متعلق شبہ رہ گیا تو انہوں نے پھر سوال کیا۔ ان کے جواب میں یہ تصریح کر دی گئی کہ جو کچھ مستحقین سے فاضل بچے وہ خرچ کرو چونکہ اوپر مستحقین کا ذکر ہو چکا تھا اس وجہ سے یہ مختصر جواب کافی ہوا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

اُوپر یہ بات تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے کہ یہ انفاق اور یہ جنگ دونوں ایک ہی سلسلے کی باتیں ہیں اس لئے کہ جہاد جان اور مال دونوں سے ہوتا ہے۔ اُوپر والی آیت میں اس تردد کو دور کیا ہے جو بعض ذہنوں میں مالی قربانی سے متعلق پیدا ہوا اب اس آیت میں وہ تردد رفع کیا جا رہا ہے جو جان کی قربانی کے معاملہ میں تھا۔ اس تردد کو رفع کرنے کے لئے ایک اصولی حقیقت جو واضح فرمائی وہ یہ ہے کہ انسان اپنے لئے فوز و فلاح اور عروج و کمال کا راستہ خود نہیں طے کر سکتا بلکہ وہ خدا ہی طے کر سکتا ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے، اس لئے کہ اسی کو علم ہے کہ انسانی فطرت کے مضمرات اور اس کی صلاحیتیں کیا ہیں اور وہ طریقے اور قاعدے کیا ہیں جن کو اختیار کر کے وہ اپنی تمام صلاحیتیں اجاگر کر سکتا ہے۔ اگر اپنے لئے خیر و شر کا فیصلہ کرنے کا سارا معاملہ انسان کی اپنی ہی خواہش اور اس کی اپنی ہی عقل پر چھوڑ دیا جاتا تو عجب نہیں کہ وہ اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں اپنی زندگی کے پروگرام سے وہ ساری باتیں ایک ایک کر کے خارج کر دیتا جو اس کے عروج و کمال اور اس کے روحانی و اخلاقی ارتقا کا ذریعہ ہیں کیونکہ ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے نفس کے لئے دل پسند ہو بلکہ ایک سے ایک بڑھ کر نفس پر شاق گزرنے والی ہیں۔ اسی طرح اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ وہ اپنے اندر وہ ساری باتیں جمع کر لیتا جو اس کو اسفل سافلین میں لے جانے والی ہیں کیونکہ یہ ساری باتیں نفس کے لئے نہایت آسان اور لذیذ ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ عجیب رمز ہے کہ جو چیزیں اس کے نفس کو مرغوب ہیں وہ اس کو پست کرنے والی ہیں اور جو چیزیں اس کو بلند کرنے والی ہیں وہ اس کے نفس کو عموماً بہت شاق ہیں۔ اس وجہ سے اس کی فلاح

کی راہ بتانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اُوپر لی ہے اور اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ سے اس کی رہنمائی کی ہے۔

جنگ وجہاد کے معاملے کی نوعیت بھی بعینہٖ یہی ہے۔ اس کے ظاہری پہلو پر نگاہ ڈالی جائے تو اس سے زیادہ ہولناک چیز کیا ہو سکتی ہے، لیکن بسا اوقات اس ہولناک شے کو سب سے زیادہ محبوب بنانا پڑتا ہے اس لئے کہ اگر اس سے گریز کیا جائے تو تمام انسانی اقدار بالکل تباہ ہو کر رہ جائیں۔

یہ جو فرمایا ہے کہ "اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان کسی معاملے میں خیر و شر کے پہلو کو متعین کر ہی نہیں سکتا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو اس راہ میں بہت سے مغالطے پیش آتے ہیں اس وجہ سے وہ بسا اوقات ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ یہ صرف اللہ ہی کی شان ہے کہ اس کا علم ظاہر، باطن اور ماضی و مستقبل سب کو محیط ہے اس وجہ سے اس نے انسان کی رہنمائی کے لئے زندگی کا سارا پروگرام خود بنا کر نازل فرما دیا ہے۔ اور یہ پروگرام ایسا جامع ہے کہ اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی و ترقی کا ضامن ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَ اِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

اُوپر آیات ۱۹۰ — ۱۹۵ میں اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا تھا کہ اگر مشرکین تمہارے ارادۂ حج میں مزاحم ہوں اور ان کی اس مزاحمت کے سبب سے جنگ کی نوبت آجائے تو تم ان سے جنگ کرو اور ان کو قتل کرو اگرچہ یہ جنگ اشہر حرم میں بلکہ عین حدود حرم میں لڑنی پڑے۔ یہ بات اگرچہ واضح تھی لیکن اشہر حرم کے معاملہ میں زمانہ جاہلیت سے عربوں کی روایات اتنی سخت تھیں اور ان میں جنگ و خونریزی کو وہ اتنا بڑا گناہ سمجھتے تھے کہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ بات آسانی سے نہیں اُتر سکتی تھی۔ اس طرح کے معاملات میں چونکہ جذبات کو بڑا دخل ہوتا ہے اس وجہ سے مخالفین کو پروپگنڈے کا بھی بڑا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق لوگوں کی طرف سے سوال ہوا اور قرآن نے اس سوال کا تفصیل سے جواب دیا۔

قرآن نے جس طرح اُوپر کی آیات میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اشہر حرم میں قتل و خونریزی بڑا سنگین گناہ ہے اسی طرح یہاں بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ "قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ" (کہہ دو کہ اشہر حرم میں جنگ کرنا بڑی سنگین بات ہے) لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی ہے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا، اللہ کا کفر کرنا، مسجد حرام سے اللہ کے بندوں کو محروم کرنا اور جو اپنے اعمال و عقائد کے اعتبار سے اس مسجد حرام کے سب سے زیادہ حق دار ہیں ان کو یہاں سے ہجرت پر مجبور کرنا، اشہر حرم میں جنگ کرنے سے بھی بڑے جرائم ہیں۔ اس وجہ سے اگر ان سنگین تر جرائم کے سدباب کے لئے اشہر حرم میں جنگ کرنی پڑ جائے تو یہ اشہر حرم کی حرمت کا قصاص ہوگا اور یہ گناہ نہیں بلکہ بہت بڑی نیکی ہے۔

پھر خاص طور پر "فتنہ" کا حوالہ دیا ہے کہ اَلْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ کہ یہ فتنہ جو مکہ میں پایا جا رہا ہے یہ قتل سے بھی کہیں زیادہ سنگین جرم ہے۔ فتنہ کی تحقیق ہم اُوپر بیان کر آئے ہیں کہ اس سے مراد وہ سنگدلانہ اذیتیں اور تکلیفیں ہیں جو کفار و مشرکین مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کے لئے پہنچا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ فتنہ تو قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ پھر جب یہ فتنہ آج عین بارامین اور بلد حرام میں موجود ہے، نہ سرزمین حرم کا احترام اس سے ظالموں کو روک رہا ہے اور نہ اشہر حرم کا احترام اس میں مانع ہے تو آخر مظلوموں کی مدافعت کے لئے اشہر حرم میں جنگ کیوں گناہ ٹھہرے!

پھر اس فتنہ کی سنگینی کو واضح کرنے کے لئے فرمایا کہ کفار و مشرکین مسلمانوں کو دین حق سے پھیرنے کے لئے جو مظالم کر رہے ہیں ان کی نوعیت انفرادی واقعات کی نہیں ہے جو کسی وقتی جوش کے تحت صادر ہو گئے ہوں بلکہ مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کے لئے یہ لوگ خونریز جنگوں کا ایک سلسلہ چھیڑنے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور یہ (اگر ان کے امکان میں ہو تو) اس وقت تک دم لینے والے نہیں ہیں جب تک تمہیں اسلام سے پھیرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ کیا ایسے سخت و شدید فتنہ کے مقابلہ کے لئے بھی اشہر حرم میں لڑائی گناہ ہی رہے گی!

یہاں تک تو اصل سوال کا جواب تھا۔ اس کے بعد ارتداد کے ذکر کے تعلق سے ایک مناسب موقع تنبیہہ مسلمانوں کو بھی کر دی کہ اگر ان کے ظلم و ستم سے مرعوب ہو کر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا اور اسی حالت میں مر جائے گا تو اس کے تمام اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو جائیں گے اور وہ دوزخ میں پڑے گا جس میں ہمیشہ رہے گا۔ یہاں اکارت ہونے کے لئے حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کے الفاظ

استعمال ہوئے ہیں۔ اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو بظاہر نیکی کے ہیں اور حبط سے مراد ان کا بالکل بے نتیجہ اور بے اثر ہو جانا ہے۔ یعنی اس کفر کے بعد اس نے اسلام کے جو کام کئے وہ بھی بالکل برباد ہو کر رہ جائیں گے۔

اس آیت میں ایک خاص نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ اعمال کے اکارت ہونے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو کر رہ جائیں گے، حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ آخرت میں مرتد ہو جانے والوں کے اعمال کا اکارت ہو جانا تو واضح ہے البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں ان کے اعمال کے اکارت ہونے کی شکل کیا ہوگی؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص مرتد ہو جاتا ہے وہ اسلامی ریاست میں جملہ شہری حقوق سے محروم ہو جاتا ہے، ریاست پر اس کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ اسی اصول پر اسلامی تعزیرات کا وہ قانون مبنی ہے جو مرتدوں کی سزا سے متعلق ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

کفار کے ظلم و ستم سے گھبرا کر مرتد ہو جانے والوں کا انجام بتانے کے بعد اُن لوگوں کا مقام بھی بتا دیا جو کفار کی ان تمام ستم رانیوں کے باوجود اپنے ایمان پر جمے رہیں گے اور ہجرت و جہاد کی بازیاں کھیلیں گے۔ ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ بے شک اس بات کے سزاوار ہیں کہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں۔ موقع و محل دلیل ہے کہ یہاں لفظ "اٰمَنُوْا" اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی وجہ سے ہم نے اس کا ترجمہ "اپنے ایمان پر جمے رہے" کیا ہے۔

اس وقت ہجرت اور جہاد مسلمانوں پر بیک وقت دونوں واجب تھے، بیت اللہ کی آزادی اور فتنہ کے قلع قمع کے لئے جہاد کا بھی حکم ہو چکا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اور ایمان کے تحفظ کے لئے ہجرت کا بھی، اور یہ دونوں ہی معرکے بڑے سخت تھے اس وجہ سے ان دونوں ہی باتوں کا ذکر فرمایا۔ اس میں مسلمانوں کے لئے یہ رہنمائی بھی تھی کہ کفار کی ستم رانیوں کا جواب ارتداد نہیں بلکہ ہجرت اور جہاد ہے۔

جو لوگ یہ بازیاں کھیل سکیں ان کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو سکتے ہیں۔ یعنی یقین تو ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد بھی کسی کو نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ کوئی بھی اپنے عمل سے نجات نہیں حاصل کرے گا بلکہ جس کو بھی نجات حاصل ہوگی خدا کی بخشش اور اس کی مہربانی ہی سے ہوگی، چنانچہ آگے فرما دیا

واللہ غفور رحیم۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا

اُوپر فصل کی تمہید میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ شراب اور جوئے سے متعلق یہ سوال ان کے ان فوائد کو سامنے رکھ کر بعض لوگوں نے کیا جو اس وقت کی عرب کی مخصوص سوسائٹی کی روایات کی بنا پر ان میں پائے جاتے تھے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کی نوعیت موجودہ قمار بازی اور موجودہ بادہ خواری سے بالکل مختلف تھی۔ ہمارے ہاں جوا نری قسمت آزمائی اور بربادی اور شراب نوشی نری عیاشی ہے لیکن عرب جاہلیت میں ان کے اندر ہمدردی خلق کے بعض ایسے پہلو بھی تھے جن کی بنا پر اہل عرب ان کو رذائل میں نہیں بلکہ فضائل میں گنتے تھے۔ اسی پہلو سے یہاں انفاق اور جہاد کے سلسلے میں ان کے متعلق بھی سوال پیدا ہوا کہ انفاق کی ایک راہ تو یہی ہے کہ قحط کے زمانے میں مالدار لوگ شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں اور جو کچھ جیتتے جاتے ہیں وہ غریبوں میں لٹاتے جاتے ہیں، پھر اس کے متعلق قرآن کا کیا ارشاد ہے؟

قرآن نے اس کا جواب دیا کہ ٹھیک ہے، ان میں بعض پہلو فائدے کے بھی ہیں لیکن ان سے سوسائٹی کو جو نقصانات پہنچتے ہیں وہ ان کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں اس وجہ سے اخلاقی بہبود کے نقطہ نظر سے یہ ناجائز ہیں۔ گویا قرآن نے یہاں اسلامی شریعت کا یہ مزاج بتا دیا کہ جن چیزوں کا نقصان ان کے نفع سے زائد ہے وہ اس شریعت میں ممنوع ہیں۔

بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ قرآن نے یہاں جوئے اور شراب کے جن فوائد و منافع کا اعتراف کیا ہے وہ ان کے مادی اور طبی منافع ہیں لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اول تو قرآن کو اشیا یا اعمال کے طبی و مادی فوائد سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اور اگر کسی پہلو سے ہو بھی تو آخر دنیا میں کون سی بُری سے بُری اور ناپاک سے ناپاک چیز ہے جس کے اندر مضرت کے ساتھ ساتھ کچھ پہلو فوائد کے نہ ہوں، پھر جوئے اور شراب ہی کی کیا خصوصیت ہے کہ قرآن نے ان کے ان فوائد کا اعتراف کیا؟ آخر چوری، زنا، سود، اور خنزیر وغیرہ کے اندر جو بعض پہلو فوائد کے ہیں قرآن نے ان کا اظہار کیوں نہیں کیا؟

ہمارے نزدیک اس ساری غلط فہمی کے سبب تین ہیں۔ ایک تو یہ کہ لوگوں نے اس جوئے اور

اور وہ اپنے بھائیوں کی زیاد[illegible] سے واقف تھے، اس لئے جب ان کے بھائیوں نے انہیں اندھے کنوئیں میں پھینکا تو فوراً انہیں اشارہ ہوا کہ بھائیوں کا ظلم کسی روز آشکارا ہو کے رہیگا۔ قرآن میں ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ وَاَجْمَعُوٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِىْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (یوسف ۱۵)

پھر جب وہ اس کو لے کر گئے اور اس کو اندھے کنوئیں میں پھینکنے کا فیصلہ کر لیا تو ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تو ان کی اس کرتوت سے انہیں ضرور باخبر کرے گا اور وہ شعور نہ رکھتے ہوں گے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی نوعمری تھے کہ ایک مظلوم کی نصرت وحمایت کے جذبے کے تحت انہوں نے ایک ظالم قبطی کو مُکا رسید کر دیا۔ دوسرے انبیائے کرام کے حالات میں بھی اسی طرح کے واقعات ملتے ہیں۔

بندہ جب اپنے رحیم پروردگار کو پہچان لیتا ہے اور اس حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں کی بدولت زندہ ہے تو اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، وہ خدا کے عدل پر بھروسہ کرتا ہے اور قیامت کی جزا وسزا کے ایک شدنی امر ہونے کا یقین کر لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بندہ ہر طرف سے کٹ کر خدا کا ہو رہتا ہے، اس کی مقرر کردہ بندشوں میں رہ کر تسکین پاتا ہے اور تمام معاملات میں اسی کی مدد کا طالب ہوتا ہے۔ بندے کی اسی کیفیت کو اس دُعا سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ (فاتحہ ۔۴)

ہم تیری ہی بندگی کرتے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

اس وقت آدمی کی سب سے اہم و برتر حاجت جس کا وہ خدا سے سوال کرتا ہے، یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے عدل کے ان رستوں پر چلائے جو پروردگار کے ہاں پسندیدہ ہیں۔ انہی رستوں پر چل کر اطاعت وعبودیت کا وہ مقصود حاصل ہوتا ہے جس کا تقاضا مخلوقات سے کیا گیا ہے۔ اس طریقہ سے آدمی خدا کے مطیع بندوں کے نقش قدم پر چلتا اور گمراہی کے ان گڑھوں میں گرنے سے بچ جاتا ہے جو رب سے اس کو دُور کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہی حقیقت ذیل کی آیات میں بیان ہوئی ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ

ہمیں سیدھے راستے پر چلا (یعنی عدل وحق کے

الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ (فاتحہ ۵، ۶)

راستے پر جو خدا تک پہنچاتا ہے) ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا (یعنی وہ انصاف پسند لوگ جن کو خدا نے اپنے راستے پر چلنے کی توفیق دی) نہ ان کا جن پر غضب ہوا (کیونکہ انہوں نے علم ہونے کے بعد حق کو چھوڑا اور اس پر دنیوی زندگی کو ترجیح دی) اور نہ گمراہوں کا (جن کے دل بد اعمالی کے سبب سے سیاہ ہو گئے، انہوں نے علم کے دروازے اپنے اُوپر بند کر لئے اور جانوروں کی طرح اندھے بہرے بن گئے)۔

اسی سیدھے راستے کی ہدایت وہ کامل بشری وحی ہے جو فطرت انسانی کے کمال کے مطابق حاصل ہوتی ہے۔ ایک طاہر و مطہر نفس اپنی پاکیزہ فطرت کے باعث اسے سنتا ہے کیونکہ صرف پاکیزہ فطرت ہی روح قدسی کا مہبط بن سکتی ہے۔

نبی جب اس فطری الہام سے بھر چکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف وحی کا اضافہ کر دیتا ہے تاکہ وہ ظالم لوگوں کو تنبیہ کرے۔ نبی کی تعلیم کی ابتدا توحید اور قیامت کی جزا وسزا کے تصور سے ہوتی ہے، جس کی بنیاد شکر اور جس کا ضد کفر ہے۔

نبی اپنی ذات میں ایک پیغام ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں اس کا ذکر پیغام کے بدل کے طور پر آیا ہے۔ سُورہ طلاق میں ہے۔

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝ (طلاق ۱۰)

اللہ نے تمہاری طرف ذکر نازل کیا ہے یعنی رسول جو تمہیں اللہ کی واضح آیات پڑھ کر سُناتا ہے تاکہ تمہیں تاریکی سے روشنی کی طرف نکالے۔

اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ آپ کا اخلاق قرآن تھا۔ یعنی قرآن کے آئینہ میں حضور کا عکس دیکھ لو۔ جو کچھ اس میں ہے وہ آپ کے اخلاق کے موافق ہے۔ یہ حقیقت بالکل اسی طرح ہے جس طرح ایک فنکار کی تصویر میں اس کا ذہن جھلکتا ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی وحی ہے لیکن نبی کے اخلاق سے پوری مطابقت رکھتی ہے کیونکہ خدا کا کلام اسی شخص پر نازل ہوتا ہے جس کے اندر اس

کے قبول کرنے کی پوری استعداد ہو۔

قرآن میں رسول کا لفظ "ذکر" کے بدل کے طور پر بالکل اسی طرح آیا ہے جس طرح "عذاب" کا بدل فرعون آیا ہے۔ فرمایا

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ مِن فِرْعَوْنَ إِنَّهُ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِينَ ۝ (دخان)

ہم نے بنی اسرائیل کو ذلت کے عذاب یعنی فرعون سے نجات دی۔ بلاشبہ وہ حد سے گزرنے والوں میں کا ایک جابر تھا۔

یہاں بھی یہ حقیقت ظاہر کرنی مقصود ہے کہ فرعون مجسم عذاب تھا۔

بعثتِ انبیاء کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر انبیاء بھیجنے کا سلسلہ کیوں شروع فرمایا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ ہمارے نزدیک اس سوال کا یہ جواب صحیح نہیں کہ انسان کی عقل خدا کی معرفت اور عدل کے تصور سے خالی تھی، اس لئے خدا نے انبیاء کو اس کی ہدایت پر مامور فرمایا۔ یہ دونوں چیزیں تو عقل انسانی میں موجود تھیں۔ انبیاء صرف ان کی یاد دہانی کرانے کے لئے آئے۔ مزید برآں ان کی بعثت کا ایک مقصود یہ بھی تھا کہ انسان کے لئے حقیقت کے دو گواہ ہوں، ایک اس کے باطن میں عقل، دوسرا خارج میں وحی۔ تاکہ ہدایت حاصل کرنے کے متنوع ذرائع کی موجودگی میں اس پر خدا کی حجت تمام ہو سکے۔ اس حقیقت کو سورہ انعام میں یوں بیان فرمایا ہے۔

يَٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ ءَايَٰتِي وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا قَالُوا۟ شَهِدْنَا عَلَىٰٓ أَنفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوا۟ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا۟ كَٰفِرِينَ ذَٰلِكَ أَن لَّمْ يَكُن رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَ

اے گروہ جن و انس، کیا تمہاری طرف تمہی میں سے رسول نہیں آئے جو تمہیں میری آیات سناتے تھے اور اس دن کی ملاقات سے تمہیں متنبہ کرتے تھے۔ وہ کہیں گے، ہم اپنے اوپر گواہ ہیں۔ دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں رکھا اور وہ اپنے خلاف یہ گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔ یہ اس لئے ہے کہ تیرا رب بستیوں کو ان کے گناہ

أَهْلُهَا غَٰفِلُونَ ۝ (انعام-۱۳۹)

کے سبب سے اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں جبکہ وہ بے خبر ہوں۔

دوسری جگہ فرمایا:

رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ (نساء-۱۶۵)

اور بھیجے رسول بشارت دینے والے اور تنبیہہ کرنیوالے تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس خدا کے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

گویا حق و باطل میں فرق کرنے کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت میں بصیرت ودیعت کر دی لیکن ہم پر مزید فضل یہ فرمایا کہ تنبیہہ و تذکیر کے لئے رسول بھیجے۔

ایک عقلمند آدمی جب یہ دیکھتا ہے کہ دُنیا میں خواہشات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے ہیں، عقل کی گمراہیاں پھیلی ہوئی ہیں اور نفس کی تربیت کے سلسلہ میں ارباب عقل کی رائیں با ہمدگر مختلف ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے رسول بھیج کر راہ ہدایت روشن رکھی ہے۔ وہ اسی کو ذریعہ نجات سمجھ کر مطمئن ہو جاتا ہے، اسی پر ثابت قدم رہتا ہے اور اسی کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں نجات کا راستہ اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور وہ امن چین اور قلبی اطمینان کے ساتھ اس پر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ ہدایت کے نقطہ نظر سے اس شخص کے لئے نبی کا وجود اسی طرح غنیمت ہوتا ہے جس طرح دُنیا کے مسائل میں اسٹیٹ کا وجود غنیمت ہوتا ہے جو ملک میں احکام عدل کے نفاذ کا باعث ہوتی ہے اور جس کے تحت رہتے ہوئے ہر شخص کا مفاد حاصل ہوتا اور تہذیب و تمدن جس سے ترقی پاتا ہے۔

جو شخص نبوت کی ضرورت کا منکر ہو، اس کی مثال اس شخص سے بھی بدتر ہے جو اسٹیٹ کی ضرورت کا قائل نہ ہو اور معاشرت و تمدن جیسے فطرت انسانی کے اہم ترین تقاضوں کو ختم کرنے کی دعوت دیتا ہو۔ اگر حقیقت یہی ہوتی کہ نیکوکاروں کے لئے انبیاء کا وجود اسی طرح ضروری نہ ہوتا جس طرح بادشاہوں کا وجود ضروری ہے تو ہمیں تاریخ انسانی میں ریاست اور نبوت دونوں کا پہلو بہ پہلو وجود نظر نہ آتا۔ ان دونوں کا ساتھ ساتھ پایا جانا ہی اس بات کا ثبوت مہیا کرتا ہے کہ انسان کی فطرت میں

دونوں کا داعیہ موجود ہے اور انسان اصلاً عدل کو پسند کرتا ہے، یوم آخرت کے وقوع اور عملوں کی جزا پر یقین رکھتا ہے اور ایک عادل خدا کو مانتا ہے۔

باقی رہا یہ اعتراض کہ اگر انسان کی اصل فطرت یہی تھی تو دنیا میں گمراہی و سرکشی کے علمبرداروں کا وجود کیا معنی؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ جس طرح ریاست کے باغیوں، ملک میں فساد پھیلانے والوں اور رعایا پر ظلم کرنیوالے جابر حکمرانوں کے پائے جانے سے انسان کے اندر عدل کی فطرت کی نفی نہیں ہوتی، اسی طرح گمراہوں اور بدکرداروں کے وجود کی بنا پر انسان کی نیکی کی فطرت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کے لوگ ہمارے نزدیک ایک بیماری میں مبتلا ہیں جبکہ فطرت انسانی ان امور پر مشتمل ہے جن کا تقاضا ایک انسان اپنی صحت کی حالت میں کرتا ہے۔ اور اُوپر ہم واضح کر چکے ہیں کہ توحید انسان کی اصل فطرت ہے۔

انبیاء کی ضرورت کے بارے میں دو باطل نقطہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ فطرت انسانی کو اس سے زیادہ اہمیت دیتا ہے جس اہمیت کی وہ واقعی مستحق ہے۔ یہ لوگ انبیاء کی ضرورت کے قائل نہیں۔ دوسرا گروہ فطرت کو اس کے اصل مقام سے گرا کر یہ کہتا ہے کہ انسان کے فطری شر اور نفس کی ناپاکی کے باعث نجات کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ دونوں گروہ انسان کی فطرت کو اس کی اصل شکل میں نہیں دیکھتے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ مخلوقات کے معاملات محض امکان یا اتفاق پر منحصر نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی قوتوں میں اضافہ پہ اضافہ کر کے ان پر احسان کرتا ہے۔ مثلاً وُہ چاہتا تو کھانے کی ایک ہی قسم پیدا کرتا یا روزی کمانے کا ایک ہی ذریعہ مقرر کر دیتا اسی طرح اگر وہ انسانوں کو ایک آنکھ اور ایک کان عطا کرتا تو انہیں اسی پر قناعت کرنی پڑتی لیکن اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بندوں کو اَن گنت نعمتیں عطا کرتا ہے اور بے شمار امور میں دوسری مخلوقات پر ان کو فضیلت بخشتا ہے۔ ہدایت کے معاملہ میں بھی اس نے انسانوں کیلئے متعدد اسباب ہدایت پیدا کئے اور اسے صرف فطرت ہی پر نہیں چھوڑ دیا اس طرح اس نے ایک طرف تو انسان پر اپنی نعمت تمام کی اور دوسری طرف اس پر حجت قائم کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر وہ ہدایت کے معاملہ میں محض فطرت کی بنیاد پر انسانوں کا مواخذہ کرتا تو یہ بھی عدل ہوتا کیونکہ آسمان و زمین خدا کی نشانیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ رسُول اور کتابیں بھیج کر ان پر مزید احسان فرمایا۔ قرآن

میں شریعت کو نعمت قرار دینے[1] کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ رسول بندگان الٰہی کو ان لوگوں کے بُرے اعمال کی تقلید سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں جو نیکی کے راستہ سے ہٹ کر چلتے ہیں اور جو اپنے حقیقی آقا اور مولیٰ سے منہ موڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اب اگر کوئی شخص رسولوں کی بات پر دھیان نہیں دیتا حالانکہ وہ پورے جذبہ خیر خواہی، پوری فصاحت اور نہایت قطعی دلائل کے ساتھ کہی جا رہی ہے تو وہ خود اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے۔ اور اس پر وہ خود ہی ملامت کا مستحق ہے نہ کہ کوئی اور۔ اولاً تو وہ خود اپنے آقا سے بھاگا ہے۔ ثانیاً وہ بلانے والے کی بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ثالثاً وہ ان تمام بُرے نتائج کا منکر ہے جو اس کی شرارت کی پاداش میں اس کے سامنے آنے والے ہیں۔

نبی کی بعثت قوم کا یوم حساب ہوتا ہے

یہ بھی جاننا چاہیئے کہ کسی قوم میں نبی کی بعثت ان کے لئے حساب اور فیصلہ کے دن کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات قرآن سے بھی واضح ہوتی ہے اور دوسرے صحیفوں سے بھی اسی کی تصریح ہوتی ہے۔ لہٰذا بعثت کے بعد باطل پر حق کے غلبہ کا وقت قریب آجاتا ہے۔ قوم کے اس بحران کے زمانہ میں تین حالتوں میں سے کوئی نہ کوئی حالت ضرور ظہور میں آجاتی ہے۔

---

[1] مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ کیجیے:

۱۔ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ○ (بقرہ - ۴۷)

اے بنی اسرائیل میرے اس انعام کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور میں نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔

اس آیت میں اس نعمت کا حوالہ دیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کو شریعت عطا کر کے برگزیدہ کرنے کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

۲۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَمِیْثَاقَهُ الَّذِیْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ (مائدہ - ۷)

اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو اور اس کے اس عہد کو جو اس نے تمہارے ساتھ ٹھہرایا۔

اس آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے، انہیں نعمت شریعت کا احساس دلایا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ یہ شریعت اللہ تعالیٰ کے درمیان اور ان کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ (مترجم)

چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار بخشا ہے اس لئے اس نے اختیار سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ایک وسیع مدت مقرر کر دی ہے۔ اس مدت میں انسان اپنی طبعی خباثتیں خوب نکال لیتا ہے جب ایک قوم فطرت کی حدوں کو پامال کرتی چلی جاتی ہے اور باطل ہی کی طرف جھک کر اسی میں غوطہ زن ہو جاتی ہے تو خدا اس کی آزمائش کا پیمانہ لبریز کر دیتا ہے، عدل و جزا کے ظاہر ہونے کا وقت آجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس قوم کو تباہ کر کے کسی دوسری قوم کو زندگی بخشتا ہے۔ حضرت موسیٰ اور پیغمبر عالمؐ کی بعثت میں یہی معاملہ پیش آیا۔ حضرت یعقوبؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی ذریت کے انتقام میں فرعون اور کسریٰ کی قومیں مٹا دی گئیں۔

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم اپنی شرارتوں کی پاداش میں ہلاک کر دی جاتی ہے مگر اس کی ذریت میں سے خدا ایک نئی اُمت برپا کر دیتا ہے۔ اور یہی جماعت ہلاک ہونے والوں کی جگہ زمین کی وارث بنتی ہے۔ یہ عمل بالکل اسی طرح کا ہے، جس طرح کا عمل ہمیں حیوانات و نباتات میں نظر آتا ہے۔ ان کے لئے ایک مُدت مقرر ہے۔ جب یہ مدت ختم ہو جاتی ہے تو نئی نسل ان کی قائم مقام بن جاتی ہے۔ اکثر انبیاء کی اُمتوں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم اپنی سرکشی کے سبب سے تباہی اور ہلاکت کی آخری منزلوں تک پہنچ جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی غفلت پر گرفت نہیں کرتا۔ پھر یہ قوم بلکہ پیغمبر کی دعوت سے چونکتی ہو جاتی ہے، اس کا ایک حصہ خدا کے آگے عاجزی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو برکت دیتا ہے اور باقی قوم پر حجت تمام کرنے کے لئے انہی لوگوں کو منتخب کر لیتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت یونسؑ، حضرت یوسفؑ اور پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوموں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

بہر حال نبی کی بعثت کے ساتھ ہی عدل کے ظہور کا وقت قریب آجاتا ہے اور نبی کی ذات گویا عدل و حساب کا مظہر ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝

حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل مٹنے ہی والی چیز ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کی طرف قرآن مجید کی متعدد آیات میں اشارات کئے گئے ہیں۔ سورۂ یونسؑ

میں ہے۔

اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۗ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝

(یونس ۴۶ - ۴۹)

یا تو جس چیز کی ہم ان کو دھمکی دے رہے ہیں، اس میں سے کچھ ہم تم کو دکھا دیں گے یا یہ ہوگا کہ ہم تم کو تو وفات دیں گے اور ان کا پلٹنا ہماری طرف ہوگا۔ پھر اللہ ان کے اعمال پر گواہ ہوگا۔ ہر اُمت کے لئے ایک رسول ہے۔ جب ان کا رسول آجاتا ہے تو عدل کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں کی جاتی وہ کہتے ہیں اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ دھمکی کب پوری ہو گی۔ کہہ دو میں تو اپنی جان کے لئے بھی کسی نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ مگر جو اللہ چاہے۔ ہر اُمت کے لئے ایک اجل معین ہے۔ جب ان کی اجل آجائے گی، نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے، نہ ایک گھڑی آگے بڑھیں گے۔

گویا انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو اُمت صالح اور نیکوکار ہے وہ زندگی اور حیات کے ولولوں سے معمور ہو جائے اور جو قوم راہ حق و ہدایت سے ہٹ کر گمراہیوں اور شرارتوں میں پڑ چکی ہے وہ تباہ ہو جائے، اور یہ بات حق و باطل کی کشمکش کے لازمی نتیجہ کے طور پر آپ سے آپ ظہور میں آجاتی ہے۔

نبی کا مخصوص معیار کارکردگی

چونکہ نبی کی ذات خدا کے عدل کا مظہر اور اس کی بعثت کا زمانہ قوم کی عدالت کا زمانہ ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نبی کے مواخذہ میں بھی کمال عدل کا اظہار فرماتا ہے۔ اس پر ان معاملات میں بھی گرفت کی جاتی ہے جن معاملات پر دوسروں سے اس شدت سے گرفت نہیں کی جاتی۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کو شفقت پر، حضرت داؤدؑ کو تمنا پر اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو محبت و رافت پر عتاب ہوا۔ اور حضرت یونسؑ کا حیا پر اور حضرت سلیمانؑ کا جہاد فی سبیل اللہ کی تیاریوں میں حد درجہ انہماک پر محاسبہ کیا گیا۔

انبیاء پر شدید گرفت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں پاکیزہ رکھنا اور برائی میں پڑنے سے بچانا چاہتا ہے۔ ہم انبیاء کے مواخذہ کے ذکر کے لئے یہاں اسی پر اکتفا کرتے ہیں، اس کی تفصیل آگے "عصمت انبیاء" کی بحث میں آئے گی۔

خود انبیاء کی فطرت بھی چونکہ عدل پر ہوتی ہے اس لئے وہ پروردگار کے ہاں تقرب کے باعث تمام لوگوں سے زیادہ خدا خوفی رکھنے والے اور عاجزی کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے احساسات کی شدت کی وجہ سے خدا کے آگے جھکے ہوئے رہتے ہیں۔ ان کا یہ حال انہیں رب کی عنایات کا خاص طور پر مستحق بنا دیتا ہے۔ ان کے معاملہ میں اللہ کی سنت ان کی استعداد کے مطابق اور اس عدل کے مطابق ظاہر ہوتی ہے، جس کا مظاہرہ پورے زمانہ بعثت میں ہوتا ہے۔

اعلان! —— اپیل!

ماہنامہ "میثاق" کے فروری ۱۹۶۴ء کے شمارہ سے رسالہ کے صفحات میں عارضی طور پر چار ورق کی کمی کی جا رہی ہے۔ اس کا سبب کاغذ اور وسائل طباعت و اشاعت کی موجودہ گرانباری ہے۔ اس وقت رسالہ جس تعداد میں شائع ہو رہا ہے اس کے پیش نظر فی پرچہ (۴۸ صفحات پر) کم از کم ۵۹ پیسے لاگت آتی ہے اس کے بعد جو کچھ تھوڑا سا پس انداز ہوتا ہوا نظر آتا ہے وہ ایجنٹ حضرات کے کمیشن اور بعض کی بے اعتنائی کی بھینٹ چڑھ کر نقصان کا باعث بنتا ہے۔ مزید برآں پرچے کی ایک کثیر تعداد تبادلہ اور نمونہ و تعارف میں بھی نکالی ہے۔ ہم نے "میثاق" کے خریدار حضرات سے نئے خریدار بنانے کی اپیل کی تھی اور اس ذریعہ سے مدد و اعانت چاہی تھی مگر افسوس ہے اب تک اپیل کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس رسالہ کو پسند کرنے والا ہر فرد اگر ایک نیا خریدار بنائے تو اس کی اشاعت فوراً دگنی ہو جاتی ہے —— اب ہم نے زبردستی "میثاق" کو پڑھنے والے ہر شخص سے (چار ورق کی کمی کی) اعانت حاصل کر لی ہے لیکن چونکہ یہ چیز بہرحال ہے ناگوار خاطر، اس لئے جونہی حالات نے اجازت دی یہ خلا فوراً پُر کر دیا جائے گا۔ اس دوران میں یہ کمی عبارت کو حتی الامکان گنجان کر کے بھی ایک حد تک پوری کی جائے گی۔

"مدیر"

اقتباسات و تراجم

قرآن سے بے تعلقی

جناب محمود احمد صاحب

قرآن سے بے تعلقی کی متعدد شکلیں ہیں۔ کبھی اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ قرآن سننے کا شوق ختم ہو جاتا ہے اور اس پر ایمان اٹھ جاتا ہے۔ کبھی اس پر عمل کرنے اور اس کے ٹھہرائے ہوئے حرام و حلال پر رہوار نفس کو روکنے میں بے بسی کا اظہار ہوتا ہے، خواہ بظاہر اسے پڑھنے کا اہتمام بھی ہو اور اس پر ایمان کا دعویٰ بھی۔ ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ بندہ قرآن کو حکم بنانا اور دین کے اصول و فروع میں قول فیصل کے لئے اس کی طرف رجوع کرنا ترک کر دیتا ہے، اس کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے کہ یقین حاصل کرنے کے لئے قرآن کچھ مفید نہیں، اس کے دلائل الفاظ کا گورکھ دھندا ہیں جن سے حقیقی علم حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن سے بے تعلقی کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ اس پر غور و فکر کرنے، اس کو سمجھنے اور کہنے والے کے منشا سے واقف ہونے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ وہ لوگ بھی اسی ضمن میں آتے ہیں جو جملہ قلبی امراض اور وساوس نفس میں قرآن سے چارہ جوئی اور شفا طلبی نہ کریں اور اس کو نظر انداز کر کے دوسری چیزوں سے شفا چاہیں۔

قرآن کا آیت

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔

"اور رسول پکار اٹھا کہ میرے پروردگار میری قوم نے تو اس قرآن کو پس پشت ڈال دیا۔"

بے تعلقی کی ان تمام شکلوں پر حاوی ہے، اگرچہ ان میں سے بعض شکلیں نسبتاً معمولی ہیں۔

قرآن کی طرف سے بے اطمینانی اور دل کی تنگی کا بھی یہی حال ہے کبھی تو اس کے منزل من اللہ ہونے اور خدا کا برحق کلام ہونے کے بارے میں کھٹک پیدا ہو جاتی ہے، کبھی دل میں یہ وسوسہ جاگزیں ہو جاتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ مخلوقات ہی میں سے کسی کا شاہکار ہے جسے اس نے لوگوں سے ہمکلام ہونے کیلئے الہام کیا۔ کبھی اس کی کفایت اور عدم کفایت کے پہلو سے دل تنگ ہونے لگتا ہے اور یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ قرآن بندوں کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کے ہوتے ہوئے بھی معقولات، قیاس آرائیوں، عقلی گدوں اور سیاسی ہیر پھیر کے بغیر چارہ نہیں۔ بعض اوقات یہ گھٹن قرآن کی دلالت اور ان حقائق

کے بارے میں ہوتی ہے جو اس کی آیات سے مراد ہوتے ہیں۔ لوگ ان حقائق کی ایسی ایسی تاویلات کر لیتے ہیں جن کا اصل سے کوئی جوڑ نہیں ہوتا۔ کبھی ان حقائق کا اصل مقصود ہی مشتبہ ہونے لگتا ہے۔ اور یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ باتیں فی الحقیقت مراد ہیں یا ان کا ذکر صرف مصلحت کی خاطر کیا گیا ہے۔ قرآن کے بارے میں اصلاح کے خیالات رکھنے والے تمام لوگوں کے دلوں میں اس کی طرف سے گھٹن پیدا ہو جاتی ہے خود انہیں اس کا شعور ہوتا ہے اور اسے وہ اپنے دلوں میں جاگزیں پاتے ہیں چنانچہ تم کوئی بدعتی ایسا نہیں پاؤ گے جس کے دل میں ان آیات کے بارے میں کھٹک نہ ہو جو اس کی بدعت کے خلاف پڑتی ہوں۔ اسی طرح کوئی ظالم اور فاجر ایسا نہ ملے گا جو ان آیات کے سبب سے دل گرفتہ نہ ہو جو اس کے منصوبوں کے راستے میں حائل ہوتی ہوں۔ پس یہ نکتہ اچھی طرح دلنشین کر لو اور پھر جو راہ چاہو اختیار کرو۔

اللہ پر توکل

توکل علی اللہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بندہ اپنی دنیاوی آسائشوں اور حاجتوں کے حاصل کرنے اور دکھ درد سے چھٹکارا پانے میں اللہ پر توکل کرے۔ دوسری یہ کہ بندہ ان چیزوں کے حصول کے لئے خدا پر توکل کرے جنہیں اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے اور جو اس کے نزدیک پسندیدہ ہیں، مثلاً ایمان، جہاد اور دعوت الی اللہ۔ توکل کی اس قسم کو پہلی قسم پر جو فضیلت حاصل ہے اس کا احاطہ خدا ہی کر سکتا ہے البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بندہ جب دوسری قسم کا توکل کرتا ہے اور اس کا حق ادا کر دیتا ہے تو اس کا یہ توکل پہلی قسم کے توکل کو خود بخود سمیٹ لیتا ہے۔ ہاں جب وہ صرف پہلی قسم کے توکل پر اکتفا کرے تو یہ بھی اگرچہ ایک حد تک کفایت کرتا ہے لیکن اس کی عاقبت بہرحال اس بندے کی سی نہیں ہو سکتی جو خدا کی محبوب اور پسندیدہ چیزوں میں اس پر توکل کرتا ہے۔ لہٰذا توکل کا عظیم ترین درجہ یہ ہے کہ ہدایت، توحید خالص، پیروی رسول اور اہل باطل سے جہاد جیسے اہم معاملات میں اللہ پر توکل کیا جائے اور یہی توکل خدا کے فرستادوں اور ان کے خاص متبعین کا امتیاز تھا۔

توکل کبھی تو اضطرار اور مجبوری کا توکل ہوتا ہے جب بندہ اس کے سوا کوئی دوسری راہ ہی نہ پا رہا ہو، اسباب و وسائل تنگ ہو جائیں، دل گھٹنے لگے اور یہ یقین ہو جائے کہ اب پناہ مل سکتی ہے تو صرف خدا کے ہاں، لیکن کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ ایسا توکل آسانی اور کشائش حاصل ہونے پر بھی برقرار رہے۔ اس

کے برعکس توکل اختیاری بھی ہوتا ہے جب یہ ان اسباب و وسائل کے ہوتے ہوئے کیا جائے، جن کے ذریعے سے مراد اور مقصود کے حصول کا گمان ہو۔ اسباب و وسائل حرام و حلال دونوں قسم کے ہوتے ہیں اگر یہ اسباب ایسے ہوں جن کے اہتمام کا ہمیں حکم دیا گیا ہے تب تو ان سے بے پرواہی قابل ملامت ہوگی۔ لیکن اگر توکل سے صرف نظر کر کے صرف وسائل ہی پر بھروسہ کیا جائے تو یہ اور بھی زیادہ مذموم حرکت ہوگی کیونکہ نص قرآنی اور اجماع امت کی رو سے اسباب اور توکل دونوں کو بیک وقت جمع کرنا واجب ہے۔ البتہ مطلوب تک پہنچنے کا اگر ایک ہی وسیلہ ہو، اور وہ حرام ٹھہرایا جا چکا ہو تو اس کے قریب بھی نہ پھٹکنا چاہیئے اور توکل ہی کو واحد وسیلہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ مراد تک پہنچنے اور مکروہات سے جان چھڑانے کے لئے توکل ایک مؤثر وسیلہ ہی نہیں بلکہ مؤثر ترین وسیلہ ہے۔ جب یہ صورت ہو کہ کسی سبب کا حرام و حلال ہونا ثابت نہ ہو تو بندے کو خوب غور کر کے یہ متعین کرنا چاہیئے کہ آیا اس کے اختیار سے توکل کمزور پڑتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کے اختیار سے پائے توکل میں لغزش آئے، دلجمعی کی کیفیت باقی نہ رہے اور ارادہ متزلزل ہو جائے تو ایسے وسیلے سے صرفِ نظر بہتر ہے۔ البتہ اگر اس سے توکل میں کوئی کمی نہ آئے تو اختیار اولیٰ ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ احکم الحاکمین کی حکمت نے ہی توکل کا سبب سے ناتا جوڑا ہے، لہٰذا بندے کے لئے یہ کسی طرح روا نہیں کہ اس کی حکمت کو معطل کرنے کے درپے ہو تا وقتیکہ کہ اس حکمت کا لحاظ رکھنا ممکن نہ رہے۔ جب کسی وسیلے کو اختیار بھی بندگی ہی کے جذبے کے ساتھ کیا جائے تو کیا کہنے، پھر تو گویا دل اور اعضاء و جوارح سب خدا کی بندگی میں شریک ہو گئے۔ دل خدا پہ توکل کرکے اور اعضاء و جوارح اس وسیلے کا اہتمام کرکے جس سے مقصود تک پہنچنے کی توقع ہو۔ توکل کا ثبوت جس چیز سے ملتا ہے وہ اسباب و وسائل کے حصول کی کوشش ہی ہے۔ جو شخص یہ کوشش نہ کرے اس کا توکل صحیح نہیں۔ جس طرح مناسب اسباب و وسائل کا اہتمام ہی مال و دولت حاصل کرنے کے خواب سچ کر دکھاتا ہے اور ان اسباب سے بے پرواہی برتنے والے کی امیدیں بے بنیاد تمنا سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں اسی طرح اسباب و وسائل سے غفلت آدمی کے توکل کو بھی بے چارگی میں تبدیل کر دیتی ہے اور وہ اسی بے چارگی کو توکل کا نام دیتا ہے۔

حقیقت میں توکل کی بنیاد اور اس کی اصل خدائے واحد پر پورا قلبی اعتماد ہے۔ جس طرح غیر اللہ پر اعتماد اور بھروسہ رکھتے ہوئے خدا پر توکل کا زبانی دعویٰ کسی کام نہیں آتا اسی طرح توکل کے ساتھ اسباب و وسائل کے حصول سے بھی کسی نقصان کا اندیشہ نہیں بشرطیکہ آدمی کے دل کے کسی گوشے میں بھی ان پر اعتماد نہ

ہو اور وہ ان پر بھروسہ نہ کرے۔ پس زبان کا توکل ایک شے ہے اور دل کا توکل ایک الگ شے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے زبان کی توبہ اجب کہ دل گناہوں سے چمٹا رہے، ایک چیز ہے اور دل کی توبہ، خواہ زبان گنگ ہی کیوں نہ رہے، ایک الگ چیز چنانچہ اللہ پر توکل کا دعویٰ، درآنحالیکہ دل میں کسی دوسرے پر اعتماد جاگزین ہو، ایسا ہی ہے جیسے کوئی زبان سے توبہ توبہ کی ضربیں لگائے اور حال یہ ہو کہ وہ گناہوں میں لت پت ہو اور ان سے چمٹا رہنے کا تہیہ بھی کئے ہوئے ہو۔

(الفوائد)

مکتبۂ میثاق!

رحمان پورہ اچھرہ لاہور ۱۲

- آپ کو ہر کتب خانہ کی دینی اور علمی مطبوعہ کتابیں فراہم کر سکتا ہے۔
- جب بھی آپکو کسی کتاب کی ضرورت ہو تو ایک پوسٹ کارڈ تحریر فرمایئے!
- بھارت کی کتابیں بھی دستیاب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
- چھ روپے -/۶ سے زائد قیمت کی کتابوں پر ڈاک خرچ معاف!

"مینجر"

محی الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا۔